پہلے فقیر کی کہانی

حقہ پینے کے بعد پہلے فقیر نے اپنی کہانی یوں شروع کی:

"دوستو! میں یمن کا رہنے والا ہوں۔ میرا باپ بہت بڑا تاجر تھا۔ شہر میں اس کی بڑی بڑی دوکانیں تھیں۔ لاکھوں کا لین دین کرتا۔ دور دور اس کی شہرت تھی۔ میں اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ مجھ سے بڑی ایک بہن تھی۔ اس کی شادی ہوچکی تھی۔ وہ اپنے میاں کے ساتھ سسرال میں رہتی تھی۔ میری پرورش بڑے لاڈ پیار سے ہوئی۔ بڑا ہوا تو پڑھنا لکھنا، سپاہ گری کا فن، سوداگری کا بہی کھاتہ سیکھا۔ چودہ برس نہایت بےفکری میں گذرے۔ اتفاق کی بات کہ میرے والدین ایک ہی سال میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کے مرنے کا غم ہوا۔ رفتہ رفتہ جی سنبھلا تو خود کو دولت کا مالک پایا۔ اللے تللے سے خرچ کرنے لگا۔ کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ تھا۔ بڑی بہن ضرور تھی لیکن میں نے کبھی اس کی خیریت دریافت نہیں کی۔ باپ کے مرنے پر اس غریب کا خط بھی آیا تو اس کا جواب نہیں دیا۔ ہر وقت دوستوں میں رہتا۔ خوب گلچھڑے اڑ رہے تھے۔ کاروبار کی طرف ذرا بھی دھیان نہیں دیا۔ بس باپ کی جمع کی ہوئی دولت خرچ ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ ساری رقم ایک ایک کرکے ختم ہو گئی۔ نوکر چاکر گھر کا سامان چرا کر کنارے لگے۔ سارے دوست آشنا جو دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے کافور ہو گئے۔ کوئی بات پوچھنے والا نہ رہا۔ اب میں دنیا میں

باغ و بہار

بہت زمانے کی بات ہے۔ روم کے ملک میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کا نام آزاد بخت تھا۔ وہ بڑا نیک اور رحمدل تھا۔ ہر وقت اپنی رعایا کی بھلائی کے لئے کام کرتا رہتا۔ اس کی سلطنت میں رہنے والے ہنسی خوشی زندگی گذارتے۔ ہر گھر میں دن عید اور رات شب برات تھی۔ چور چکار، جیب کترے، اٹھائی گیرے کا ڈر نہ تھا۔ ساری رات گھر کے دروازے کھلے رہتے۔ راہی مسافر سونا اچھالتے چلے جاتے۔ کوئی نہ پوچھتا منہ میں کے دانت ہیں۔

کتنا اچھا تھا یہ بادشاہ! — لیکن بے چارے کو ایک بات کی فکر تھی۔ اس کی قسمت کے باغ میں کوئی پھل نہ تھا۔ وہ سوچتا کہ میرے بعد تخت پر کون بیٹھے گا۔ اتنی بڑی سلطنت کون سنبھالے گا۔ شاہزادہ ہوتا تو میرے گھر کا چراغ روشن رہتا۔ اللہ نے ملک، دولت سب کچھ دیا، اس اندھیرے گھر کا دیا نہ دیا۔ یہی باتیں سوچ سوچ کر وہ ہر وقت اداس رہتا۔

بادشاہ آزاد بخت کا دستور تھا کہ وہ راتوں کو بھیس بدل کر گلی گلی گھومتا، اپنی رعایا کا حال دریافت کرتا۔ کسی گھر سے رونے کی آواز آتی تو وجہ معلوم کرتا۔ کہیں چولھا نہ جلتا تو فوراً اپنے کاندھوں پر سامان لاد کر چپ چاپ وہاں پہنچا دیتا۔

ایک دفعہ کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ بادشاہ گھومتا گھامتا ایک قبرستان میں جا پہنچا۔ رات بڑی اندھیری تھی۔ ہوا سائیں سائیں چل رہی تھی۔ درخت کے پتے کھڑکھڑا رہے تھے۔ بادشاہ ڈر ڈر کر قدم بڑھا رہا تھا۔ ایکا ایکی اسے ایک چراغ جلتا ہوا نظر آیا۔ بڑا تعجب ہوا کہ اتنی تیز ہوا میں یہ کیونکر جل رہا ہے۔ وہ اور آگے بڑھا تو اسے چار شخص بیٹھے دکھائی دئے۔ اندھیری اور سنسان رات میں ان چاروں کو دیکھ کر آزاد بخت بہت ڈرا۔ معلوم نہیں کون لوگ ہیں۔ جن ہیں کہ بھوت ہیں۔ اس نے چاہا کہ قدم آگے دھرے لیکن عقل نے سمجھایا کہ جلدی نہ کر۔ ذرا دیکھ لے یہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ چھپ کر حقیقت ان لوگوں کی جاننا چاہئے۔ یہ سوچ کر وہ چپ چاپ آگے بڑھا اور ایک کونے میں چپکا جا بیٹھا۔

وہ چاروں فقیر تھے۔ سر پر الجھے ہوئے بال، منہ پر بڑی بڑی ڈاڑھی، گلے میں کفنی پہنے، یہ سب بیٹھے آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ ایک فقیر بولا:

"رات بڑی پہاڑ ہوتی ہے۔ بہتر ہے کہ ہم سب اپنی اپنی آپ بیتی بیان کریں۔ دلچسپی بھی رہے گی، رات بھی کٹ جائے گی۔"

دوسرا فقیر بولا "جناب! آپ کی یہ رائے صحیح ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ ہی سب سے پہلے ہمیں اپنی آپ بیتی سناتے۔"

پہلا فقیر کہنے لگا "مجھے انکار نہیں۔ ذرا دو کش حقہ کے لگا لوں تو پھر کہانی شروع کروں۔"

سبھوں نے مل کر کہا "ضرور، ضرور!"

بالکل تنہا تھا۔ گھر میں کوئی چیز نہ تھی۔ سب کچھ یا تو لٹ چکا تھا، یا میں نے بیچ دیا تھا۔ کھانے کو کچھ بھی نہ تھا۔ میں بالکل فقیر ہوچکا تھا۔ لالچی دوستوں نے مجھے ہر طرح برباد کر دیا تھا۔ اب مجھے ہوش آیا۔ لیکن کیا فائدہ!

اس پریشانی کے عالم میں وہی بہن یاد آئی۔ گرتا پڑتا ہزار محنت سے وہاں پہنچا۔ میری حالت دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ منہ سے یہ بھی نہیں نکالا کہ تم نے مجھے بھلا دیا تھا۔ خط کا جواب تک نہ دیا۔ وہ ماجائی میری بلائیں لینے لگی۔ اپنے نوکروں سے مجھے نہلوایا۔ اچھی پوشاک پہنوائی۔ کھانے کو طرح طرح کی چیزیں پیش کیں۔ صبح ناشتے میں شربت، لوزیات، حلوہ سوہن، پستہ اور مغز آتا۔ شام کے وقت میری بہن مجھے خشک میوہ اور پھل کھلاتی۔ دونوں وقت کھانے میں پلاؤ، نان، قلیہ، کباب وغیرہ کھلواتی۔ خوب خاطر داری کرتی۔ کئی مہینے اس فراغت سے گزرے۔

ایک روز بڑی محبت سے کہنے لگی:

"تم میری آنکھوں کی پتلی ہو۔ میرے ماں باپ کی نشانی ہو۔ میں تمہیں دیکھ کر باغ باغ ہوتی ہوں۔ ایک لمحہ کے ئے بھی تمہیں اپنی نظر سے دور کرنا نہیں چاہتی۔ لیکن بھیا!۔ تمہارے اس طرح پڑے رہنے میں بڑی بدنامی ہے۔ تم یہ خوب جانتے ہو کہ مردوں کو خدا نے کمانے کے لئے بنایا ہے۔ گھر میں بیٹھے رہنا ان کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے اس کو دنیا والے طعنہ مہنا دیتے ہیں۔ خصوصاً اس شہر کے آدمی چھوٹے بڑے سب تمہارے رہنے پر کہیں گے کہ اپنے باپ کی دولت کھو کھا کر بہنوئی کے ٹکڑوں پر پل رہا ہے۔ اس میں بڑی بے غیرتی ہے۔ ہم دونوں کی جگ ہنسائی ہوگی۔ ماں باپ کے نام کو الگ بٹہ لگے گا۔ ورنہ میں اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا کر تمہیں پہناؤں اور کلیجے میں ڈال رکھوں۔ بہتر ہے کہ تم تجارت کا سامان لیکر دوسرے ملک میں جاؤ۔ خدا چاہے تو دن پھریں گے اور مفلسی کے بدلے خوشی حاصل ہوگی۔"

بہن کی یہ باتیں میرے دل کو لگیں۔ اس کی نصیحت پسند کی۔ نہایت ادب سے میں نے کہا۔ "تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔ مجھے اب کچھ کام کرنا چاہئے۔ بہت ٹھوکریں کھا چکا ہوں۔ لیکن میرے پاس سامان خریدنے کے لئے پیسے کہاں ہیں؟"

"بھیا تم اس کی فکر کیوں کرتے ہو۔ بس سفر پر جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ روپیہ پیسے کی فکر نہ کرو۔ پچاس توڑے اشرفی مجھ سے لے لو۔ آج ہی بازار جا کر تجارت کا سامان خرید لو۔ اور سنو! ۔ ایک قافلہ سوداگروں کا دمشق کو جاتا ہے۔ تم سب سامان کسی ایماندار تاجر کے حوالے کرکے پکی دستاویز لکھوالو۔"

اپنی بہن کے کہنے کے مطابق میں نے اچھے اچھے سامان خریدے اور سرائے میں جا کر معلوم کیا۔ اتفاق سے ایک قافلہ دریا کی راہ سے دمشق جا رہا تھا۔ میں قافلہ کے سردار سے ملا۔ سامان اس کے حوالے کر اور رسید لے، میں نے خشکی کی راہ چلنے کی تیاری کی۔

دوسرے دن جب رخصت ہونے لگا تو بہن نے ایک گھوڑا جڑاؤ ساز سے سجا، مجھے دیا۔ ایک خاص دان میں مٹھائی اور پکوان بھر کر ہرنے سے لٹکا دیا۔ شکار بند میں پانی کی چھاگل بندھوا دی۔ امام ضامن کا روپیہ میرے بازو پر باندھا۔ ماتھے پر دہی کا ٹیکہ لگایا اور آنسو پی کر بولی:

"بھیا! ۔ سدھارو! ۔ تمہیں خدا کو سونپا۔ جس طرح پیٹھ دکھائے جاتے ہو اسی طرح جلد اپنا منہ دکھائیو۔"

بہن کو خدا حافظ کہہ کر میں گھوڑے پر سوار ہوا اور خدا کے توکل پر بھروسہ کرکے دمشق کی طرف روانہ ہوا۔ جنگل بیابان طے کرتا اور پہاڑ دریا سے گزرتا آخر دمشق کے پاس جا پہنچا۔ بہت رات جا چکی تھی۔ شہر کے تمام دروازے بند پڑے تھے۔ میں نے بہت منت کی کہ مسافر ہوں لیکن

دربان کھڑک کر بولا :

"اس وقت دروازہ کھولنے کا حکم نہیں۔ کیوں اتنی رات گئے تم آئے ؟"

آخر مجبور ہو کر گھوڑے سے اتر پڑا اور زین پوش کو زمین پر بچھا کر لیٹ گیا۔ رات کی بھیانک تاریکی، سنسان علاقہ، نہ آدم نہ آدم زاد ! طرح طرح کے جانوروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ مارے خوف کے نیند نہ آئی۔ آخر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ جس وقت آدھی رات ادھر اور آدھی رات ادھر ہوئی تو دیکھتا کیا ہوں کہ قلعہ کی دیوار سے کوئی چیز لٹک رہی ہے۔ پہلے تو ڈر کر آنکھیں بند کرلیں۔ پھر ہمت کرکے غور سے دیکھا تو ایک صندوق نظر آیا جو ایک رسی سے بندھا ہوا بہت ہی آہستہ آہستہ نیچے آرہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ زمین پر ٹھہر گیا۔ میں اٹھ کر اس صندوق کی طرف چلا اور ڈرتے ڈرتے اسے کھولا۔ میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس میں ایک بہت خوبصورت اور نازک سی لڑکی زخمی حالت میں پڑی کلبلاتی تھی۔ اس کے جسم پر بےشمار گھاؤ تھے۔

جوں توں کرکے رات کاٹی۔ صبح ہوئی تو اس صندوق کو اپنے گھوڑے پر لادا اور شہر میں داخل ہوا۔ ایک مکان کرائے پر لیا۔ اس لڑکی کو چارپائی پر لٹایا اور جراح کی تلاش میں نکلا۔ بڑی مشکل سے اس کے گھر کا پتہ چلا۔ میں نے اس کو سارا حال بتایا۔ اس نے مجھ پر ترس کھا کر کہا :

"اے مسافر ! گھبراؤ نہیں۔ میں ابھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" اور اپنا کام چھوڑ چھاڑ میرے ساتھ ہو لیا۔ بڑی محنت سے اس لڑکی کے زخم دھوئے اور مرہم لگایا۔ کھانے کے لئے مرغ کا شوربہ بنایا۔

میں بھی دن رات اس لڑکی کی تیمارداری میں لگا رہا۔ اسی درمیان میرا سامان بھی آگیا۔ میں نے اونے پونے ساری چیزوں کو بیچ ڈالا اور اسی رقم سے علاج کراتا رہا۔ آخر خدا نے اس کو صحت دی۔ غسل شفا کیا۔ میں نے خلعت اور اشرفیاں عیسوی جراح کو دیں۔

کرائے کے مکان میں رہتے ہوئے ایک مدت گزر گئی۔ میرا سارا مال رفتہ رفتہ صرف ہوا۔ دل بہت گبھرایا۔ لڑکی کو میری مصیبت کا پتہ چل گیا۔ ایک دن خط لکھ کر مجھے دیا کہ شیدی بہار کو دے آؤں۔ میں وہاں پہنچا تو اس آدمی نے رقعہ پڑھتے ہی فوراً اشرفیوں کی گیارہ کشتیاں غلاموں کے سر پر رکھوا کر میرے حوالے کیں۔ میں بڑا حیران ہوا کہ ماجرا کیا ہے لیکن پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ لڑکی نے پہلے ہی منع کردیا تھا کہ میں اس کے کام میں دخل نہ دوں۔

ایک دن وہ لڑکی مجھ سے کہنے لگی :

"آدمی کو صاف ستھرا لباس پہننا چاہئے۔ پھٹا اور میلا پہننے سے اعتبار نہیں رہتا۔ یہ اشرفیاں لو اور چوک میں یوسف سوداگر کی دوکان پر جاؤ۔ وہاں سے جواہر اور زرق برق خلعتیں خرید لاؤ۔ میں نے خاموشی سے اشرفیاں لیں اور یوسف کی دوکان پر پہنچا۔ وہ ایک عمدہ قالین پر بیٹھا ہوا تھا۔ بڑا ہی خوبصورت جوان تھا۔ سنہرے بال، بڑی بڑی آنکھیں، گورا رنگ، ہوبہو شاہزادہ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے خریداری کرکے اٹھنا چاہا۔ لیکن یوسف مجھے پاس بٹھا کر بڑی محبت سے بات چیت کرنے لگا۔

"آپ اس ملک میں پردیسی معلوم ہوتے ہیں؟"

"جی ہاں ! ـ میں یمن کا رہنے والا ہوں۔ تجارت کی غرض سے آیا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر آپ میری دعوت قبول فرمالیں۔ دیکھئے دل نہ توڑیئے گا۔" یہ بات اس نے اس انداز سے کہی کہ بے اختیار دل کو بھائی۔ میں انکار نہ کرسکا۔

گھر آکر اس لڑکی کو سارا قصہ کہہ سنایا۔ اس نے کہا :

"تم نے یوسف کی دعوت قبول کرلی ہے، لہٰذا اپنا وعدہ پورا کرو۔ اس کے یہاں ضرور جاؤ۔ انسان کو ہر حالت میں اپنا قول پورا کرنا چاہئے۔"

غرض اس لڑکی کی اجازت لے کر میں یوسف کے گھر پہنچا۔ اس نے دل کھول کر میزبانی کی۔ ایک سے ایک عمدہ کھانے کھلوائے۔ اپنے خوش نما باغ میں لے گیا اور وہاں کی خوب سیر کرائی۔ اپنی بیوی سے بھی ملاقات کرائی جسے دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔ کالی کلوٹی، بھتنی جیسی عورت تھی۔ خود یوسف تو اتنا حسین اور اس کی بیوی جیسے الٹا توا۔ لیکن کیا کہتا۔ لاحول پڑھ کر چپ ہو رہا۔

جب گھر آیا تو وہ لڑکی کہنے لگی کہ "مفت کی مہمانیاں کھا ہی کر چپکے ہو رہو گے یا اس کا بدلہ بھی اتاروگے۔ لازم ہے کہ یوسف کو اپنے ساتھ لاؤ۔"

میں دوسرے روز یوسف کے یہاں گیا اور دعوت دی۔ وہ عذر اور حیلے کے بعد تیار ہوا۔ میں اسے ساتھ لے کر گھر چلا۔ لیکن راہ میں یہی فکر کرتا کہ اپنے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ معمولی سا مکان ہے اور وہ بھی کرائے کا! پردیس میں پڑا ہوں، کیوں کر اس کی تواضع کر سکوں گا۔ جب گھر کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دروازے پر دھوم دھام ہو رہی ہے۔ یساول اور عصا بردار کھڑے ہیں۔ تمام حویلی میں فرش جابجا بچھا ہے۔ مسندیں لگی ہوئی ہیں۔ پاندان، گلاب پاش، عطر دان، پیک دان، چنگیریں، نرگس دان قرینے سے دھرے ہیں۔ طاقوں میں رنگ برنگ کے رنگترے، کنولے، نارنگیاں اور گلابیاں چنی ہوئی ہیں۔ جھاڑ، فانوس اور کنول ہر طرف چھتوں میں روشن ہیں۔ تمام دالان اور شہ نشینوں میں طلائی شمع دانوں پر کافوری شمعیں چڑھی ہوئی ہیں۔ سب آدمی اپنے اپنے عہدوں پر مستعد ہیں۔ باورچی خانہ میں دیگیں ٹھنٹھنا رہی ہیں۔ آب‌دار خانے میں کوری کوری ٹھلیاں گھڑونچیوں پر دھری ہیں۔ ان کے اوپر صافیاں بندھی ہیں۔ چوکی کے اوپر ڈونگے، کٹورے، تھالیاں سرپوش سے ڈھکی نظر آرہی ہیں۔

میں دل میں حیران تھا کہ یا الٰہی اتنے عرصے میں یہ سب تیاری کیوں کر ہوئی۔ غرض یہی سوچتا ہوا یوسف کو لے جا کر ایک مسند پر بٹھایا۔ پھر اٹھ کر حویلی میں گیا۔ دیکھا تو کھانے کا بڑا انتظام ہے۔ ایک طرف لڑکی بھی نظر آئی۔ وہ خبرگیری میں ضیافت کے لگ رہی تھی۔ مجھے یوں پھرتے دیکھا تو کہنے لگی:

"یہ کون آدمیت ہے کہ مہمان کو اکیلا چھوڑ دیا۔ جاؤ مجلس میں بیٹھو۔ مہمان کی ہر طرح خاطرداری کرو۔ یوسف جب جانا چاہے روک لینا۔ آدمی بھیج کر اس کی بیوی کو بھی بلوا لینا۔" یہ کہہ کر وہ تو کام میں لگ گئی اور میں باہر یوسف کے پاس آگیا۔

تمام دن رونق رہی۔ میں خوشی خوشی مہمان داری کرتا رہا۔ شام ہوئی تو وہ اداس دکھائی دینے لگا۔ میں نے پوچھا "خیر تو ہے؟" کہنے لگا:

"اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ میری بیوی گھر پر پریشان ہوگی۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں۔" میں نے کہا:

"یار یوسف! جی نہیں چاہتا کہ تم ابھی چلے جاؤ۔ آج رات کا کھانا تو ضرور کھاؤ۔ اگر کہو تو آدمی تمہاری بیوی کو بلانے کی خاطر جائے۔"

یہ سنتے ہی خوش ہو کر بولا:

"بہت اچھا۔ اس وقت تم نے میرے دل کی بات کہی۔"

میں نے ایک خوجے کو بھیجا۔ تھوڑی دیر میں اس کی کالی بھتنی سی بیوی آگئی۔ میں نے اس کا استقبال کرکے نہایت تپاک سے برابر اس جوان کے لابٹھایا۔ جوان اس کو دیکھتے ہی ایسا خوش ہوا جیسے دنیا کی نعمت ملی۔ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔

رات کا کھانا واقعی عمدہ تھا۔ قسم قسم کی چیزیں دسترخوان پر چن دی گئی تھیں۔ کھانے کے بعد گانے کی محفل جمی۔ بھانڈ، بھگتیے، کلاونت اور قوال اچھی پوشاک پہنے، حکم کے منتظر تھے۔ کافی رات تک جشن ہوتا رہا۔ آخر تھک کر سب آدمی مجلس کے بےخبر ہوگئے اور میں بھی غافل پڑ گیا۔

جب صبح ہوئی اور آفتاب دو نیزے بلند ہوا، تب میں اٹھا۔ آنکھ مل کر جب ادھر اُدھر دیکھا کچھ بھی نہ پایا۔ سامان غائب تھا۔ رات کی رونق ختم ہوچکی تھی۔ نہ وہ ملازم تھے نہ عصا بردار، نہ جھاڑ فانوس تھے، نہ فرش اور مسند! ہر طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ مگر ایک کونے میں کمبل اوڑھے کوئی سوتا دکھائی دیا۔ آگے بڑھ کر کمبل ہٹایا تو ایک خوفناک چیخ میرے منہ سے نکلی۔ یوسف اور اس کی بیوی کی گردنیں کٹی ہوئی تھیں۔ یہ حالت دیکھتے ہی حواس جاتے رہے۔ عقل کچھ کام نہیں کرتی تھی کہ یہ کیا تھا اور کیا ہوا۔ میں چیختا ہوا کمرے سے نکلا۔ اندر حویلی میں گیا۔ کہیں آدمی کا نام و نشان نہ تھا۔ وہ لڑکی بھی موجود نہ تھی۔

اتنے میں محلی، جسے ضیافت کے کام کاج میں دیکھا تھا، نظر پڑا۔ فقیر کو اس کے دیکھنے سے کچھ تسلی ہوئی۔ احوال اس واقعہ کا پوچھا۔ اس نے جواب دیا:

"تجھے اس بات کی تحقیق کرنے سے کیا حاصل جو تو پوچھتا ہے؟" اس پر میں نے کہا "خیر، نہ کہو۔ بھلا یہ تو بتاؤ وہ لڑکی کس مکان میں ہے؟"

بارے محلی نے مہربان ہو کر اس پری کے مکان کا نشان بتایا اور مجھے رخصت کیا۔ آپ ان دونوں کے گاڑنے دابنے کی فکر میں رہا۔

میں گرتا پڑتا ڈھونڈتا شام کے وقت اسی پتے پر جا پہنچا اور دروازے کے قریب ایک گوشے میں ساری رات گزار دی۔ کوئی احوال پرسان میرا نہ ہوا۔ اسی بے کسی کی حالت میں صبح ہو گئی۔ جب سورج نکلا اس مکان کے بالا خانے کی ایک کھڑکی سے وہ لڑکی میری طرف دیکھنے لگی۔ اس وقت عالم خوشی کا جو مجھ پر گذرا دل ہی جانتا ہے۔ شکر خدا کا کیا۔ اتنے میں ایک محلی میرے پاس آیا اور نہایت تسلی دے کر ہاتھ پکڑ لیا اور ایک

طرف لے چلا۔ میں اس کے ساتھ ایک بہت بڑے باغ میں داخل ہوا۔ بارے خدا نے لڑکی کے دل کو مہربان کیا۔ سر سے پاؤں تک موتیوں میں جڑی آئی اور تخت پر بیٹھ گئی۔ اس کے آس پاس کنیزیں ادب سے کھڑی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی غصے سے کہنے لگی:

"اس کے حق میں یہی بھلا ہے کہ سو توڑے اشرفی کے لے۔ اپنا اسباب درست کرکے وطن کو سدھارے۔"

میں یہ بات سنتے ہی کاٹھ ہوگیا۔ رونی صورت بنا کر کہنے لگا:

"اگر مجھ کم‌نصیب کو دنیا کا لالچ ہوتا تو اپنا جان و مال حضور میں نہ کھوتا۔ مجھے تو امید تھی کہ آپ اس عاجز کو قبول فرمالیں گی۔"

یہ سن کر تیکھی ہو تیوری چڑھا کر خفگی سے بولی:

"چھوٹا منہ بڑی بات۔ بس چپ رہ۔ اگر کسی اور نے یہ حرکت کی ہوتی چیل کووں سے اس کی بوٹیاں نچواتی۔ پر کیا کروں؟ - تیری خدمت یاد آتی ہے" اور خفگی کے عالم میں اٹھ کر چلی گئی۔ میں نے بہتیرا سر پٹکا لیکن متوجہ نہ ہوئی۔ لاچار میں بھی مایوس ہو کر محل سے نکلا۔

اس پری پیکر کی جدائی میں دن رات آنسو بہاتا۔ دیوانوں کی طرح جنگل بیابان کی خاک چھانتا۔ نہ کھانے کی فکر نہ پہننے کا ہوش۔ تن پر کپڑا نہیں۔ جہاں چاہتا سو رہتا۔ بچے دیوانہ سمجھ کر پتھر مارتے۔ راہگیر آتے جاتے تنگ کرتے۔ چند ہی روز میں کمزور اور لاغر ہو گیا۔ چلنے پھرنے کی سکت نہ رہی۔ شاہزادی کے محل کے سامنے ایک مسجد تھی۔ اسی کی سیڑھیوں پر پڑ گیا۔

اس حالت میں مہینوں گزر گئے۔ میری حالت بدتر ہو گئی۔ وہی خواجہ سرا جمعہ کی نماز پڑھنے آیا تو اس نے مجھے پہچان لیا۔ واپس جا کر شاہزادی سے میری حالت بیان کی۔ آخر شاہزادی کو وہ وقت یاد آیا جب وہ صندوق میں زخموں سے چور پڑی تھی۔ بچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس وقت یہی فقیر کام آیا تھا۔

یہ خیال آتے ہی خواجہ سرا کو بھیجا کہ مجھے فوراً محل میں لے آئے۔ شاہی حکیموں کو بلوا کر میرا علاج کرایا۔ سبھوں نے کہا کہ اسے کوئی بیماری نہیں۔ اپنی ناکامی پر مرا جاتا ہے۔ اگر اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے تو امید ہے یہ مریض جی اٹھے۔

تب اس لڑکی نے مجھ سے پوچھا:

"آخر بتاؤ تو سہی، تم چاہتے کیا ہو؟"

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "میری بس یہی خواہش ہے کہ آپ مجھے قبول کر لیں۔"

آخر کار اس نے یہ درخواست منظور کرلی۔ میری حالت مارے خوشی کے بہتر ہوتی چلی گئی۔ چند ہی روز میں تندرست ہو گیا۔ تب ایک دن نہایت خاموشی سے میری شادی اس سے ہوگئی۔

لیکن یہ تمنا پوری ہو جانے کے بعد بھی میں اداس رہنے لگا۔ دل میں ایک کھٹک تھی جو نہ جاتی تھی۔ خاموش پڑا رہتا۔ آخر ایک دن اس نے مجھ سے پوچھ ہی لیا:

"کہاں تو یہ حال تھا کہ شادی کے لئے مرے جاتے تھے۔ اب کامیاب ہوگئے تو بھی اداس نظر آتے ہو۔ آخر بات کیا ہے؟"

یہ سن کر میں نے کہا "بڑی آرزو اور مراد یہی تھی سو مجھے ملی۔ لیکن دل میرا دبدھے میں ہے۔ اگر میری خاطر منظور ہے تو یہ بتاؤ کہ ایک پرچی لکھ بھیجنے سے اتنے توڑے اشرفیوں کے کیوں کر ملے؟ یوسف جب مہمان ہو کر آیا تو ضیافت کا سامان کس طرح ہوا اور ان دونوں کو قتل کس نے کیا؟"

جب اس نے دیکھا کہ سوائے کہنے کے چھٹکارا نہیں، لاچار ہو کر بولی:

"میں اس ملک کی شاہزادی ہوں۔ ایک بار بیمار پڑی تو میرے بوڑھے ملازم نے اپنے شاگرد کے ہاتھ دوا بھجوائی۔ یہ بڑا سیدھا سادا نیک اور خوبصورت لڑکا تھا۔ مجھے یہ لڑکا بہت اچھا لگا اور اس لڑکے کو میں نے اپنی خدمت میں رکھ لیا۔ میں اس پر بےحد مہربان تھی۔ یہ سوچ کر کہ یہ کام کا آدمی بن جائے، چوک میں اس کے لئے دوکان جوہری کی کرادی۔ تھوڑے عرصے میں اس کی دوکان چمکی اور وہ خاصا مشہور ہو گیا۔

ایک دن اس لڑکے نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں پچاس ہزار روپے میں اس کو ایک باغ خرید دوں۔ تمہیں تو وہ باغ یاد ہوگا؟"

"جی اچھی طرح یاد ہے — وہی نہ، جس میں یوسف نے میری دعوت کی تھی؟"

"ہاں، تو وہ لڑکا کہنے لگا کہ اس باغ کے ساتھ ایک کنیز بھی مفت میں مل جائے گی جو موسیقی میں خوب سلیقہ رکھتی ہے۔ میں نے اس کی فرمائش فوراً پوری کردی۔

"ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ خیال آیا کہ اس باغ کی سیر کیا چاہئے۔ چپ چاپ وہاں پہنچی۔ دیکھا کہ وہی کنیز، جو کالی بھتنی جیسی تھی، اس لڑکے کی بیوی بنی ہوئی ہے۔ جی جل گیا۔ میں غصے سے آگ بگولا ہوگئی۔ تب لڑکا بہت گھبرایا۔ ایک طرف کونے میں جا کر معلوم نہیں دونوں میں کیا مشورہ ہوا۔ کچھ دیر بعد لڑکے نے مجھ سے معافی مانگی۔ میں تو اس لڑکے پر مہربان تھی ہی معاف کردیا۔

"پھر وہی کنیز شربت کے پیالے طشت میں سجائے قریب آئی۔ اس کو دیکھ کر جی متلاتا تھا، پر لڑکے کی خاطر خاموش رہی۔ شربت کا پیالہ ہاتھ میں دے کر اس نے مجھے اصرار کرکے پلایا۔ میں انکار نہ کر سکی۔ غٹاغٹ پی گئی۔ شربت پیتے ہی مجھے چکر آنے لگا۔ پھر بےہوش ہو چلی۔ لڑکے نے اس چڑیل کے بہکانے پر مجھے تلوار سے گھائل کر دیا۔ جب یقین ہو گیا کہ میں مر گئی تو صندوق میں بند کرکے قلعہ کے باہر لٹکا دیا۔ اللہ نے تم کو وہاں پہنچا دیا اور میری جان بچی۔

"تمہیں معلوم ہے یہ لڑکا کون تھا؟ یہ یوسف جوہری تھا۔

"میں دل ہی دل میں ان سے بدلہ لینے کا ارادہ کر چکی تھی۔ تم کو رقعہ دے کر خواجہ سرا کے پاس بھیجا۔ اپنے زندہ رہنے اور تمہارے مکان میں ٹھہرنے کی خبر اسے دی۔ تمہارے اخراجات کے لئے رقم طلب کی۔ تم کو یوسف سوداگر کی دوکان پر خلعت لینے بھیجا تاکہ وہ اپنی عادت کے مطابق تم سے دوستی کرلے۔ پھر ضیافت میں اسے اور چڑیل نوکرانی کو اپنے یہاں بلوا کر قتل کرانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس موقع پر جو لوازمہ دعوت کا ہوا وہ سب اسی خواجہ سرا نے آکر انجام دیا تھا۔"

اس کے بعد شاہزادی نے کہا کہ اس ملک میں ہم لوگوں کا رہنا ٹھیک نہیں۔ چنانچہ ایک رات اس نے شاہی اصطبل سے دو عمدہ گھوڑے منگوائے۔ مردانہ لباس پہنا، ہتھیار لگائے اور ہم دونوں ایک طرف کو روانہ ہو گئے۔ چلتے چلتے ایک دریا ملا۔ اسے پار کرنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ شاہزادی کو ایک درخت کے نیچے بٹھایا اور میں کشتی کی تلاش میں نکلا۔ بہتیرا سر مارا پر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر مایوس ہو کر وہاں سے پھر آیا تو اس ملکہ کو پیڑ کے نیچے نہ پایا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ آواز دی۔ کہیں نہ ملی۔ سارا جنگل چھان مارا۔ اس کا پتہ نہ چلا۔ معلوم نہیں جن لے گیا۔ بھوت نے پکڑ لیا۔ کسی دیو نے اٹھا لیا۔ میں نے ساری دنیا میں تلاش کیا، لیکن شاہزادی نہیں ملی۔ ایک دن مایوس ہو کر چاہا کہ پہاڑ سے نیچے کود جاؤں۔ اتنے میں ایک نقاب پوش بزرگ گھوڑے پر سوار آئے اور کہنے لگے:

"کیوں اپنے مرنے کا قصد کرتا ہے۔ خدا کے فضل سے ناامید ہونا کفر ہے۔ جب تک سانس ہے تب تک آس ہے۔ تھوڑے دنوں میں روم کے ملک میں تین اور درویش ایسی ہی مصیبت میں پھنسے ہوئے تجھ سے ملاقات کریں گے۔ وہاں کے بادشاہ کا آزاد بخت نام ہے۔ اس کو بھی بڑی مشکل کا

سامنا ہے۔ جب وہ بھی تم چاروں فقیروں کے ساتھ ملے گا ہر ایک کے دل کی مراد بخوبی حاصل ہوگی۔"

"وہ اتنا فرما کر نظروں سے پوشیدہ ہو گئے اور اس فقیر نے خاطر جمع کرکے قصد "قسطنطنیہ" کا کیا۔ خدا کے فضل سے یہاں تک آ پہنچا اور اپنی خوش نصیبی سے آپ لوگوں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہماری تمہاری آپس میں ملاقات تو ہوئی، اب چاہئے کہ بادشاہ آزاد بخت سے بھی جان پہچان ہو۔ جب ہی ہم سب اپنے دلی مقصد کو پہنچیں گے۔ تم سب دعا مانگو اور آمین کہو! یہ تھی میری سرگذشت جو کہہ سنائی ۔" اتنا کہہ کر پہلا فقیر خاموش ہو گیا۔

آزاد بخت ایک کونے میں چھپا ہوا، دھیان لگائے، پہلے درویش کا ماجرا سن کر خوش ہوا۔ پھر دوسرے کا قصہ سننے لگا۔

جب دوسرا فقیر بھی اپنی سیر کا قصہ کہہ چکا رات آخر ہو گئی اور وقت صبح کا شروع ہونے پر آیا۔ بادشاہ آزاد بخت چپکا اپنے محل کی طرف روانہ ہوا۔ دولت خانے میں پہنچ کر نماز ادا کی۔ پھر خلعت فاخرہ پہن دیوان عام میں تخت پر آبیٹھا اور حکم کیا کہ یساول جائے اور چار فقیر جو فلاں قبرستان میں ٹھہرے ہوئے ہیں، ان کو باعزت اپنے ساتھ حضور میں لے آئے۔ بموجب حکم، چوبدار وہاں گیا۔ دیکھا تو چاروں ہاتھ منہ دھو کر اپنی راہ لے رہے ہیں۔ چوبدار نے کہا:

"شاہ جی! بادشاہ نے آپ چاروں کو طلب فرمایا ہے۔ میرے ساتھ چلئے۔"

چاروں فقیر آپس میں ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ ایک نے ہمت کرکے چوبدار سے کہا:

"بابا! ہم اپنے دل کے بادشاہ ہیں۔ ہمیں دنیا کے بادشاہ سے کیا کام ہے؟"

فقیر کی یہ بات سن کر چوبدار کہنے لگا:

"سائیں اللہ! مضائقہ نہیں، اگر چلو تو اچھا ہے۔"

اتنے میں چاروں کو یاد آیا کہ مولا علی مرتضیٰ رض نے جو فرمایا تھا، سو اب پیش آیا۔ خوش ہوئے اور یساول کے ہمراہ چلے۔ جب بادشاہ کے روبرو گئے تو چاروں فقیروں نے دعا دی کہ بابا تیرا بھلا ہو۔ بادشاہ نے حکم بیٹھنے کا کیا اور احوال پرسی فرمائی۔ پھر پوچھا کہ تمہارا کہاں سے آنا ہوا اور کہاں کا ارادہ ہے۔ بادشاہ کی یہ بات سن کر انہوں نے کہا:

"آپ کی عمر اور دولت زیادہ ہو۔ ہم فقیر ہیں۔ ایک مدت سے اسی طرح سیر و سفر کرتے پھرتے ہیں۔ جہاں شام ہوئی وہیں ہمارا گھر ہے اور جو کچھ اس دنیائے ناپائیدار میں دیکھا ہے، کہاں تک بیان کریں۔"

آزاد بخت نے ان فقیروں کی بہت تسلی اور تشفی کی۔ طرح طرح کی چیزیں کھانے کی منگوائیں اور اپنے روبرو ناشتہ کروایا۔ پھر فقیروں سے بولا:

"اب آپ اپنا اپنا قصہ کہیں۔ مجھ سے آپ لوگوں کی جو خدمت ہو سکے گی اس سے دریغ نہ کروں گا۔"

آزاد بخت کی یہ بات سن کر فقیروں نے جواب دیا:

"ہم پر جو جو کچھ بیتا ہے، نہ ہمیں بیان کرنے کی طاقت ہے اور نہ بادشاہ کو اس کے سننے سے فرحت ہو گی۔"

تب بادشاہ مسکرا کر کہنے لگا:

"رات کو جہاں قبرستان میں آپ سب اپنا اپنا احوال کہہ رہے تھے، وہاں میں بھی موجود تھا۔"

فقیروں نے جب یہ بات سنی تو مارے خوف کے کانپنے لگے اور سر نیچے کرکے چپ ہو رہے۔ طاقت گویائی کی نہ رہی۔

آزاد بخت نے جب دیکھا کہ اب رعب سے ان کے حواس بجا نہیں کہ کچھ بولیں، تو کہنے لگا:

"اس دنیا میں کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جس کے ساتھ کوئی نہ کوئی عجیب و غریب واقعہ پیش نہ آیا ہو۔ میں نے بھی ایسا تماشا دیکھا ہے۔ پہلے میں ہی اس کا بیان کرتا ہوں۔"

آزاد بخت کی یہ گفتگو سن کر فقیروں نے کہا:

"بادشاہ سلامت! ہم فقیروں پر آپ کا لطف بے انتہا ہے۔ ارشاد فرمائیے۔"

چنانچہ آزاد بخت نے اپنا قصہ، جو کہ بہت دلچسپ تھا، سنایا۔

اس قصہ کو سن کر فقیر کہنے لگے:

"خیر! جب آپ نے ہم گداؤں سے الفت کی تو ہم بھی اپنا اپنا ماجرا بیان کرتے ہیں۔"

اس کے بعد باقی فقیروں نے اپنی اپنی کہانی بیان کی، جسے آزاد بخت نے نہایت دلچسپی کے ساتھ سنا۔ پھر بادشاہ کے اسرار پر چاروں فقیر کچھ دن کے لئے محل میں ٹک گئے۔ اسی دوران میں ایک دن آزاد بخت کی ملاقات جنوں کے سب سے بڑے بادشاہ شہبال سے ہوگئی۔ اس نے پہلے فقیر کا ماجرا جو سنا تھا مفصل بیان کیا اور اس کی مدد کی سفارش کی۔ ملک شہبال نے اسی وقت جنوں کے بڑے بڑے سرداروں کو نامے لکھے کہ اس فرمان کو دیکھتے ہی اپنے تئیں حاضر کرو اور جس کسی کے پاس آدم زاد ہو ساتھ لائے۔ اگر پوشیدہ رکھے گا تو کولھو میں پیلا جائے گا۔

یہ حکم نامہ لے کر دیو چاروں طرف روانہ ہو گئے۔ دس پانچ دن کے عرصے میں جنوں کے سارے سردار حاضر ہوگئے۔ لیکن ایک جادوگر، جس نے کوہ قاف کے قلعہ میں دمشق کی شاہ‌زادی کو قید کر رکھا تھا، نہیں آیا۔ ملک شہبال نے طیش میں آکر لڑاکی فوج جنوں اور پری‌زادوں کی روانہ کی۔ ایک آدھ دن کے عرصے میں سب اسے پکڑ لائے لیکن اس نے شاہ‌زادی کا پتہ پھر بھی نہ بتایا۔ تب ملک شہبال نے پری‌زاد کے لشکر کو تعینات کیا کہ کوہ قاف میں جا کر ڈھونڈ ڈھانڈ کر شاہ‌زادی کو لائے۔ آخر وہ لشکر شاہ‌زادی کو تلاش کرکے لے آیا اور حضور میں پہنچایا۔

پہلا فقیر جو سوداگر تھا یمن کا اور دمشق کے سلطان کی بیٹی دونوں ہنسی خوشی بادشاہ آزاد بخت کے ساتھ رہنے لگے۔

میر امن نئے روپ میں

"............... میر امن کی باغ و بہار کہاں گل کھلا رہی ہے ۔"

انعام درانی

"............... نیشنل بک فاؤنڈیشن نے یہ کتابیں لکھوائی ہیں اور یہیں کے ممتاز مصوروں ناہید جعفری، منصور اے، سامعہ شہاب الدین اور شجیع کاظمی نے انکو اپنے نقوش قلم سے مرصع کیا ہے ۔"

ابن انشا

"............... ساری کتابیں رنگین تصویروں سے آراستہ ہیں ۔ انکی تحریر سلجھی ہوئی اور تصویریں دلکش ہیں ۔ کاغذ بھی عمدہ ہے اور طباعت نفیس ۔ مجموعی طور پر یہ کتابیں دوسرے ممالک سے درآمد کی ہوئی کتابوں کے اعلیٰ معیار کے مطابق ہیں ۔"

مساوات

جملہ حقوق محفوظ

اشاعت دوم ۱۹۷۴

قیمت : ایک روپیہ

ناشر : نیشنل بک فاؤنڈیشن

کراچی ۔ اسلام آباد ۔ لاہور

طابع : گولڈن بلاک ورکس ۔ کراچی